کے استعمال کی اجازت نہیں تھی، تاہم مکہ ہی میں آخری دور میں مسلمانوں کو یہ حق دے دیا گیا۔ یہ اجازت اس صورت میں دی گئی کہ ان کی تعداد ایک اندازے کے مطابق ساڑھے سات سو سے زیادہ نہیں تھی۔ کیا جن مظلوموں کی تعداد لاکھوں میں ہو اور انہوں نے اپنے حقوق کیلئے پرامن جدوجہد کا راستہ بھی آزمایا ہو ان کو اپنے حقوق کے تحفظ کیلئے طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں ہوگی؟ اور اگر فرداً فرداً ایک ایک مظلوم کو یہ حق حاصل ہے، اور یقیناً ہے، تو اگر بہت سارے مظلوم مل کر ایک دوسرے کا تحفظ کریں تو اس میں کی قباحت ہے؟ بلکہ ایک طاقتور ظالم کے جبر سے بچنے کا بہتر طریقہ ہی یہی ہوتا ہے کہ مظلوم مل کر ایک دوسرے کا بچاؤ کریں۔ یہ عقل کا بھی تقاضا ہے اور اوپر نقل کی گئی آیات بالخصوص سورۃ الشوریٰ کی آیات کا مقتضی بھی یہی ہے۔ ان آیات میں سچے مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ باہمی معاملات مشورے سے چلاتے ہیں، پھر کئی خصوصیات بیان کر دینے کے بعد کہا گیا ہے کہ مومنوں پر جب ظلم ہوتا ہے تو وہ برابر کا بدلہ لیتے ہیں۔ گویا دفاع کا زیادہ مناسب طریقہ یہی ہے کہ مسلمان اس کے لئے شورائیت پر مبنی اجتماعی جدوجہد کریں۔ آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کرنے والی تنظیمیں اسی فلسفے پر قائم کی جاتی ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک اس کے جواز بلکہ ندب کے سلسلے میں کوئی ابہام نہیں۔ بلکہ میرے نزدیک تو یہ امر بھی بالکل واضح ہے کہ یہ جواز اور ندب بعض اوقات وجوب میں بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم، و علمہ اتم و احکم۔ (۶۵)

باقی رہا یہ سوال کہ اگر آزادی کی تحریکیں صرف استخلاص وطن کی بات کریں اور دین کی سربلندی کی بات نہ کریں تو ان کی جدوجہد کی شرعی حیثیت کیا ہوگی تو سطور بالا میں کی گئی بحث کی روشنی میں اس کا جواب بھی بالکل واضح ہے۔ شریعت نے صرف اس صورت میں ہجرت و جہاد کے احکام نہیں دیے جب دین پر عمل ممکن نہ ہو بلکہ جیسا کہ سورۃ الشوریٰ اور سورۃ النحل کی آیات سے واضح ہے شریعت نے فرد کے لئے ظلم کے خلاف طاقت کے استعمال کو اس صورت میں بھی جائز قرار دیا ہے جب اسلامی ریاست وجود میں نہ آئی ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے جان، مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی راہ میں قتل ہونے والوں کو بھی شہید قرار دیا ہے:

من اريد ماله بدون حق فقاتل فقتل دون ماله فهو شهيد۔ (۶۶)

''جس کا مال چھینا جا رہا ہو اور وہ مزاحمت کرتے ہوئے قتل کیا گیا تو وہ شہید ہے۔''

من قتل دون ماله فهو شهيد، و من قتل دون دينه فهو شهيد، و من قتل دون دمه فهو شهيد، و من قتل دون اهله فهو شهيد۔ (۶۷)

''جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہوا وہ شہید ہے، اور جو شخص اپنے دین کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہوا وہ شہید ہے، اور جو شخص اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہوا وہ شہید ہے، اور جو شخص اپنے خاندان کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہوا وہ شہید ہے۔''

من قتل دون مظلمته فهو شهيد ۔ (۶۸)

''جو شخص اپنے حق کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہوا وہ شہید ہے۔''

پس استخلاص وطن کی تحریک یقیناً جہاد کے مفہوم میں شامل ہے چاہے نفیاً یا اثباتاً دین کی سربلندی کی بات نہ کی جائے۔ البتہ اگر آزادی کی تحریک کے رہنما غیر اسلامی نظام یا مقاصد کے حصول کے نعرے بلند کریں تو ایسی صورت میں اس تحریک کو جہاد نہیں کہا جا سکے گا، اگر چہ افراد کو حق دفاع شخصی پھر بھی حاصل رہے گا۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اگر غیر مسلموں کے حملے میں مسلم حکومت شکست کھا جائے تو پھر مسلح جدوجہد جاری رہے گی یا نہیں تو یہ اجتہادی مسئلہ ہے جسے مسلمانوں کے ارباب حل وعقد حل کریں گے۔ اس سلسلے میں مختلف آرا ہو سکتی ہیں: کسی کو مسلح مزاحمت نامناسب اور نقصان دہ نظر آئے گی اور وہ مسلمانوں کی بچی کھچی طاقت کو جنگ سے گریز کر کے بچانے کی کوشش کریں گے اور کوئی مسلح مزاحمت ہی کو صحیح لائحۂ عمل مان کر جدوجہد جاری رکھیں گے۔ ایک بات بہر حال طے شدہ ہے کہ کہ دارالاسلام جب غیر مسلموں کے قبضے میں چلا جائے تو اسے چھڑانے اور اس پر سے غیر مسلموں کا تسلط ختم کرنے کی کوشش فرض عین ہوگی۔ البتہ طریق کار میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ مسلح جدوجہد کرنے والوں اور پرامن ذرائع اختیار کرنے والوں کے درمیان ہم آہنگی اور رابطہ بھی ضروری ہے۔ نیز ایسی صورت میں مسلح جدوجہد کے لئے ریاست یا حکومت کی شرط باقی نہیں رہے گی، بلکہ وہ اس کا بدل یا قائم مقام وجود میں لا کے جدوجہد کر سکتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی کو امیر جہاد مقرر کر کے اس کی اطاعت کا اقرار کریں اور اس کی سربراہی میں قتال کریں۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ ایسی صورت میں غیر مسلم قابضین کے خلاف پرامن جدوجہد تو جائز ہوگی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں، یا ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف طاقت استعمال کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا واضح فرمان ہے:

من حمل السلاح علينا فليس منا ۔ (۶۹)

''جس نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھایا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

پس اگر چند مسلمان حملہ آوروں کا ساتھ دے رہے ہوں تو ان کے خلاف کاروائی محض اس وجہ سے ناجائز نہیں ہو جائے گی کہ وہ نام کے مسلمان ہیں۔ فقہا نے صراحت کی ہے کہ اگر مسلمان غیر مسلموں کے قیدی ہوں اور غیر مسلموں پر حملے کی صورت میں مسلمانوں کے نشانہ بننے کا بھی اندیشہ ہو تب بھی حملہ جائز ہوگا بشرطیکہ حملے میں مسلمانوں کو نشانہ بنانے کا قصد نہ کیا جائے، انہیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور حملہ بہر حال ناگزیر ہو۔ (۷۰) یہ وہ صورت ہے جب مسلمان ان کے قیدی ہوں۔ پس ایسی صورت میں تو حملہ بدرجۂ اولی جائز ہوگا جب چند نام کے

مسلمان قابضین کی فوجی کاروائی میں ان کا ساتھ بھی دے رہے ہوں۔

فریضۂ دفاع کی وسعت اور اعانت کی حدود

اولاً: دفاع کا فریضہ اور مسلم ممالک

جیسا کہ واضح کیا گیا دفاع نہ صرف ایک فطری حق ہے بلکہ شرعی فریضہ بھی ہے۔ ایک مسلمان ملک پر حملہ پوری امت مسلمہ پر حملہ تصور ہوگا اور سب پر دفاع کا فریضہ عائد ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

و ما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ و المستضعفین من الرجال و النساء و الولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا، و اجعل لنا من لدنک ولیا و اجعل لنا من لدنک نصیرا۔ (۷۱)

''تمہیں ہوا کیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑ رہے جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی جانب سے ہمارا کوئی حامی اور مددگار پیدا کر دے۔''

فقہاء نے صراحت کی ہے کہ حملے کی زد میں آئے ہوئے علاقے کے لوگ اگر حملے کے خلاف دفاع نہ کر سکتے ہوں تو ان کے مجاور علاقوں پر یہ فریضہ عائد ہوگا۔ پھر اگر وہ بھی دفاع کی اہلیت نہ رکھتے ہوں یا وہ فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی کریں تو ان کے بعد کے علاقوں پر فریضہ عائد ہوگا، یہاں تک کہ یہ فریضہ دنیا کے تمام مسلمانوں پر عائد ہو جائے گا۔

ان الجھاد اذا جاء النفیر انما یصیر فرض عین علی من یقرب من العدو۔ فاما من ورائھم ببعد من العدو فھو فرض کفایۃ علیھم حتی یسعھم ترکہ اذا لم یحتج الیھم۔ فان احتیج الیھم بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومۃ مع العدو، او لم یعجزوا عنھا لکنھم تکاسلوا و لم یجاھدوا، فانہ یفترض علی من یلیھم فرض عین کالصلوٰۃ و الصوم لا یسعھم ترکہ۔ ثم و ثم الی ان یفترض علی جمیع اھل الاسلام شرقا و غربا علی ھذا التدریج۔ نظیرہ الصلوٰۃ علی المیت، ان کان الذی یبعد من المیت یعلم ان اھل محلتہ یضیعون حقوقہ او یعجزون عنہ کان علیہ ان یقوم بحقوقہ، کذا ھنا۔ (۷۲)

''نفیر عام کی صورت میں جہاد ہر اس شخص پر فرض عین ہو جاتا ہے جو دشمن سے قریب تر ہو۔ اور جو دشمن سے دور ہوں تو ان کے لئے یہ اس وقت تک فرض کفایہ ہوتا ہے جب تک جنگ میں ان کی شرکت کی ضرورت نہیں ہوتی اور

اس وجہ سے ان کے لئے اس جنگ سے الگ رہنے کا موقع ہو۔ پس اگر اس وجہ سے ان کی ضرورت پڑے کہ دشمن کے قریب کے لوگ کمزور ہیں یا کمزور نہیں ہیں مگر دفاع میں کوتاہی کر رہے ہیں تو ان کے بعد آنے والوں پر یہ نماز اور روزے کی طرح فرض عین ہو جاتا ہے جس کا تک کرنا ان کے لئے جائز نہیں ہوگا۔ اسی طرح دوسروں کی باری آئے گی یہاں تک کہ بتدریج شرقاً وغرباً تمام اہل اسلام پر یہ فرض عین ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال میت کی نماز جنازہ کی ہے۔ اگر میت سے دور رہنے والا جانتا ہو کہ اس کے پڑوس کے لوگ اس کے حقوق ضائع کریں گے یا وہ ان کی ادائیگی سے عاجز ہیں تو اس پر فرض عین ہو جاتا ہے کہ اس کے حقوق ادا کرے۔ بعینہ اسی طرح اس صورت میں بھی ہوگا۔''

گویا اسلامی ملک پر حملے کو کوئی مسلمان پرایا جھگڑا نہیں سمجھے گا، بلکہ دفاع کو اپنا فریضہ سمجھ کر ہوشیار اور بیدار رہے گا، کیونکہ کسی بھی وقت یہ امکان ہوسکتا ہے کہ یہ فریضہ اس کے حق میں فرض عین ہو جائے۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اسلامی ملک پر حملے کی صورت میں پوری امت مسلمہ میں ایک ایمرجنسی کی سی کیفیت پیدا ہو۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ مجاور علاقوں پر فریضہ عائد ہونے کا سبب یہ ہے کہ دور کے علاقوں کی بہ نسبت وہ حملے کے خلاف دفاع کی زیادہ بہتر پوزیشن پر ہوتے ہیں۔ پس اگر قریب کے علاقے یہ فریضہ احسن طریقے سے نہیں نبھا سکتے یا وہ اس کی ادائیگی میں کوتاہی کریں تو دور کے علاقے اس فرض کو ادا کرنے کے لئے آگے بڑھیں۔ موجودہ دور میں جبکہ ذرائع مواصلات نے بہت ترقی کی ہے قرب و بعد کے پیمانے بہت تبدیل ہو چکے ہیں۔ اب تو شاید زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ کس مسلمان ملک کے پاس زیادہ بہتر ہتھیار پائے جاتے ہیں؟ کس ملک کی معاشی پوزیشن زیادہ مستحکم ہے؟ کونسا ملک سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آگے ہے۔ جو جتنی زیادہ اہلیت رکھے گا اس پر فریضہ دوسرے کی بہ نسبت زیادہ جلدی عائد ہوگا۔ اس لحاظ سے یہ عین ممکن ہے کہ مجاور ملک کی بہ نسبت ایک دور دراز کے ملک ،جس کے پاس ایٹمی ہتھیار بھی ہوں اور وہ ٹیکنالوجی کے لحاظ سے بھی آگے ہو، پر دفاع کا فریضہ جلدی عائد ہو۔ یہاں ایک بار پھر اس امر کی طرف توجہ ہو کہ دفاع کا فریضہ عام حالات میں فرض کفائی ہے جو بعض اوقات فرض عین بھی بن جاتا ہے۔ اس لئے ہر مسلمان ملک اور ہر مسلمان فرد کو خود غور کر کے فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا اس کے حق میں اس کی حیثیت فرض کفائی کی ہے یا یہ اس کے حق میں فرض عین کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دفاع کا فریضہ احسن طریقے سے ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان ممالک کے درمیان باہمی رابطے بہتر ہوں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ دفاعی اور معاشی بندھنوں میں بندھ جائیں۔ اس سلسلے میں یورپی یونین اور معاہدۂ شمالی اوقیانوس کی تنظیم (نیٹو) کے تجربات سے بہت کچھ دروس وعبر حاصل ہو سکتے ہیں۔ نیٹو ممالک نے آپس میں دفاعی معاہدہ کر کے ''اجتماعی دفاع'' کے تصور کو ایک بہترین عملی شکل دے دی ہے۔ ایک ممبر ملک پر حملہ سب پر حملہ تصور ہوتا ہے اور سب مل کر حملہ آوروں کے خلاف کاروائی کرتے ہیں۔ اس طریق کار کو

بین الاقوامی قانون نے بھی صحیح تسلیم کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کی دفعہ ۵۱ نے مختلف ممالک کے اجتماعی حق دفاع کو سند جواز دی ہے۔ بین الاقوامی عدالت انصاف نے بھی اس طریق کار کو جائز ٹھہرایا ہے۔ (۷۳) اس اجتماعی حق دفاع کے متعلق ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں قرب و بعد کی بات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کوئی سے دو یا زائد ممالک، جو مشترکہ مفاد رکھتے ہوں، آپس میں دفاعی معاہدہ کر کے اجتماعی حق دفاع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے درمیان بحر شمالی اوقیانوس حائل ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس طریق کار سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

امت مسلمہ کے اجتماعی حق دفاع کے متعلق البتہ یہاں یہ بات واضح ہو کہ اس کی بنیاد کسی دفاعی معاہدے پر نہیں، بلکہ امت کے تصور پر ہے اور یہ امت پر اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے عائد کردہ فریضہ ہے۔ اسلئے اگر دو اسلامی ممالک میں دفاعی معاہدہ نہ بھی ہو تو ان پر لزم ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ تاہم موجودہ بین الاقوامی نظام اور قانون کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر مسلمان ممالک آپس میں دفاعی معاہدات بھی کر لیں تو وہ بہت سی پیچیدگیوں سے بچیں گے۔

ثانیاً: دفاع کا فریضہ اور افراد امت

جیسا کہ پچھلی سطور میں واضح کیا گیا، امت کے ہر خطے اور ہر فرد کا دفاع ایک فرض کفائی ہے جو بعض اوقات فرض عین بن جاتا ہے۔ فرض عین ہو جانے کی صورت میں اذن والدین یا اذن امام کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم، جیسا کہ پیچھے حنبلی فقیہ ابن قدامہ کے حوالے سے واضح کیا گیا، دفاع کی صورت میں بھی افراد کی اولین کوشش یہی ہونی چاہیے کہ اسے حکومت کے ماتحت رہ کر ادا کیا جائے۔ اگر حکومت اپنا فریضہ ادا نہیں کرتی تو اسے اس پر مجبور کرنا چاہیے۔ بلکہ دفاع کے فریضے میں کوتاہی برتنے والی حکومت اپنا جواز ہی کھو بیٹھتی ہے۔ حکومت اور ریاست شریعت پر بہتر طریقے سے عمل کرنے کے لئے وجود میں لائی جاتی ہیں، ورنہ وہ خود مقصود بالذات نہیں۔ اگر ریاست یا حکومت اپنا فریضہ ادا کرنے پر تیار نہ ہو اور حکومت کی تبدیلی بھی بہت دور کی بات لگتی ہو جبکہ دفاع کا فریضہ فوری طور پر ادائیگی کا متقاضی ہو تو اس صورت میں اذن امام کی شرط ساقط ہو جاتی ہے۔ فقہاء نے صراحت کی ہے:

اما اذا عم النفير بان هجم العدو على بلد فهو فرض عين يفترض على كل واحد من آحاد المسلمين ممن هو قادر عليه۔ فاذا عم النفير لا يتحقق القيام به الا بالكل، فبقي فرضا على الكل عينا بمنزلة الصوم و الصلوٰة۔ فيخرج العبد بغير اذن مولاه و المرءة بغير اذن زوجها، لان منافع العبد و المرءة في حق العبادات المفروضة عينا مستثناة عن ملك المولى و الزوج شرعا، كما في

الصوم و الصلوۃ ۔ و کذا یباح للولد ان یخرج بغیر اذن الوالدین ، لان حق الوالدین لا یظھر فی فروض الاعیان کالصوم و الصلوۃ ۔ (۷۴)

''البتہ جب نفیر عام کی صورت ہو، مثلاً جب دشمن کسی علاقے پر حملہ کردے تو جہاد فرض عین کی صورت میں ہر مسلمان فرد پر، جو اس کی مقدرت رکھتا ہو، لازم ہو جاتا ہے۔ پس نفیر عام کی صورت میں، جبکہ سب کے حصہ لیے بغیر فرض کی ادائیگی نہیں ہوسکتی، جہاد ہر فرد پر نماز اور روزے کی طرح فرض عین ہو جاتا ہے۔ پس ایسی صورت میں غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر اور عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر فرض کی ادائیگی کے لئے نکلے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فروض اعیان کی صورت میں آقا اور شوہر کی ملکیت سے غلام اور بیوی کے منافع مستثنیٰ ہوتے ہیں، جیسے نماز اور روزے کا معاملہ ہے۔ اسی طرح بیٹے کو نکلنا ہوگا خواہ اس کے والدین نے اجازت نہ دی ہو کیونکہ والدین کی اجازت فروض اعیان ، جیسے نماز اور روزے، کی صورت میں مؤثر نہیں ہوتی۔''

جو مسلمان حملے کی زد میں آئے ہوئے ہوں وہ، جیسا کہ پیچھے واضح کیا گیا، کسی امیر کی اطاعت میں ہی کاروائی کریں گے۔ ایسی صورت میں ان کی مدد کے لئے جانے والے بھی اس ریاست کے حکمران یا امیر جہاد کی اطاعت میں دفاع کا فریضہ ادا کریں گے۔

ثالثاً: دفاع کا فریضہ اور اعانت کی حدود

جہاں تک ایسی صورت میں اعانت کی حدود کا معاملہ ہے تو وہ حالات پر منحصر ہے۔ بعض اوقات محض اخلاقی مدد (مثلاً حملے کو ناجائز قرار دینا، حملے کی زد میں آئے ہوئے لوگوں کو مظلوم قرار دینا، دفاع کا فریضہ ادا کرنے والوں کو خراج تحسین پیش کرنا وغیرہ) بھی کافی ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سفارتی مدد (جیسے بین الاقوامی رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کرنا، حملہ آوروں پر سیاسی دباؤ ڈالنا، اسے بین الاقوامی برادری میں تنہا کرنا وغیرہ) بھی ضروری ہوتا ہے اور اس کے بغیر محض اخلاقی مدد سے کام نہیں چلتا۔ تاہم بعض حالات میں سفارتی اور سیاسی مدد بھی کافی نہیں ہوتی، بلکہ عملی مدد (جیسے مظلوموں تک ادویات کی رسائی، مہاجرین کی آبادکاری کے لئے کوشش کرنا، مزاحمت کرنے والوں کی مالی امداد، انہیں پناہ گاہیں فراہم کرنا وغیرہ) بھی لازم ہو جاتی ہے۔ اور بعض صورتوں میں باقاعدہ جنگ میں شرکت بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ مختصراً یہ کہ مدد کی حیثیت فرض کفائی کی ہو جاتی ہے۔ مدد کی مختلف صورتوں کو ضرورت کے مطابق اختیار کیا جائے گا۔ رہنما اصول اس سلسلے میں یہ ہے کہ کسی طور حملہ آوروں کو بلاد اسلام سے واپس دھکیلنا اور بلاد اسلام میں امن کی فضا بحال کرنا ہے، اس کے لئے جو اقدام ضروری ہو وہ اٹھایا جائے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض اشخاص پر مدد کی ایک صورت لازم ہو اور بعض پر کوئی دوسری۔ البتہ یہاں پھر یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ اگر حملے کا جواب بغیر فوجی مدد کے ممکن نہ ہو تو محض اخلاقی یا سفارتی بلکہ مالی مدد سے بھی اعانت کا

فرض ادا نہیں ہوگا۔ قرآن کے الفاظ اس معاملے میں بالکل واضح ہیں کہ مظلوموں کی مدد کے لئے فوجی طاقت استعمال کرنا بعض اوقات واجب ہو جاتا ہے اور یہ واجب صرف فوجی اعانت سے ہی ادا ہوتا ہے۔

و ما لكم لا تقاتلون في سبيل الله و المستضعفين من الرجال و النساء و الولدان الذين يقولون ربنا اخرجنا من هذه القرية الظالم اهلها، و اجعل لنا من لدنك وليا و اجعل لنا من لدنك نصيرا۔ (۷۵)

''تمہیں ہوا کیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑ رہے جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی جانب سے ہمارا کوئی حامی اور مددگار پیدا کر دے۔''

و ان استنصروكم في الدين فعليكم النصر الا على قوم بينكم و بينهم ميثاق۔ (۷۶)

''اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہو۔''

یہ بات بھی یہاں قابل ذکر ہے کہ اقوام متحدہ کے چارٹر نے بھی دفعہ ۵۱ کے تحت سلامتی کونسل کو یہ اختیار دیا ہے کہ اگر وہ یہ سمجھے کہ کسی ملک سے دنیا کے امن کو خطرہ ہے تو وہ اس کے خلاف فوجی کاروائی کر سکتی ہے۔ اور یہ بات بھی بین الاقوامی قانون کے تحت مسلمہ ہے کہ ''دنیا کے امن کو خطرہ'' کسی ملک کی حکومت کی جانب سے اپنی رعایا پر ظلم یا کسی ملک کے اندر جاری خانہ جنگی سے بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ بعض ممالک تو اس کے قائل ہیں کہ ''انسانی ہمدردی کی بنیاد پر فوجی مداخلت'' (Humanitarian Intervention) کے لئے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی اجازت لازمی نہیں ہے۔ ان کا موقف ہے کہ یہ حق انفرادی طور پر ملک یا ممالک کو بھی حاصل ہے۔ سربیا پر نیٹو کی بمباری کے لئے جو جواز بیان کئے جاتے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا۔ تاہم اکثر ممالک کا موقف یہ ہے کہ کوئی ملک سلامتی کونسل کی اجازت کے بغیر ایسی کاروائی نہیں کر سکتا۔ (۷۷) پس مسلمان ممالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے فورم پر بھرپور کردار ادا کریں اور اپنے موقف کو واضح کرنے کے لئے مشترکہ لائحہ عمل اور باہمی تعاون کی راہ اختیار کریں۔

جہاد اور معاہدات

اولاً: غیر مسلموں کے ساتھ امن کے معاہدات کا جواز اور امن معاہدات کی اقسام

جہاد کے حوالے سے ایک اہم بحث معاہدات کی ہے۔ عام طور پر مشہور یہ ہے کہ فقہاء غیر مسلموں کے ساتھ امن کے معاہدے (موادعة یا مهادنة) کو ناجائز یا کم از کم غیر مناسب تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح مشہور ہے کہ وہ کسی

دوسرے ملک میں مقیم غیر مسلموں کے ساتھ صرف اس صورت میں امن کے معاہدے کو جائز ٹھہراتے ہیں جب وہ موقت ہو، اور یہ کہ وہ صرف ایک ہی موبد معاہدے کو مانتے ہیں اور وہ ہے عقد ذمہ جس کے تحت غیر مسلم اسلامی ملک کے باشندے بن جاتے ہیں۔ (۷۸) یہ مفروضات صحیح نہیں ہیں اور ان کی بنا یہ قول ہے کہ قتال کی علت کفر یا شوکت کفر ہے۔ پچھلی سطور میں تفصیل سے واضح کیا گیا کہ فقہاء کی اکثریت کا قول یہ ہے کہ قتال کی علت محاربہ ہے۔ پس ان غیر مسلم قوموں کے ساتھ امن کا معاہدہ کرنے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے جو اسلام یا مسلمانوں کے خلاف محاربے کا ارتکاب نہیں کرتیں، بلکہ محاربین بھی جب امن کی طرف میلان دکھائیں تو ان کے ساتھ معاہدہ کر لینا چاہیے، سوائے اس صورت کے جب معاہدے سے مسلمانوں کو کوئی سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

و ان جنحوا للسلم فاجنح لها و توكل على الله۔ (۷۹)

''اور اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

فلا تهنوا و تدعوا الى السلم و انتم الاعلون و الله معكم و لن يتركم اعمالكم۔ (۸۰)

''پس تم ہمت ہار کر صلح کی درخواست نہ کرو، تم ہی غالب رہنے والے ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے، وہ ہرگز تمہارے اعمال ضائع نہیں کرے گا۔''

بعض لوگ سورۃ التوبۃ کی آیات سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ ان آیات کے نزول کے بعد غیر مسلموں کے ساتھ امن کے معاہدے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

براءة من الله و رسوله الى الذين عاهدتم من المشركين۔ (۸۱)

''اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔''

لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ اولاً تو یہ آیات رسول اللہ ﷺ کے جہاد کے ایک خاص پہلو، اتمام حجت، سے تعلق رکھتی ہیں، جیسا کہ پیچھے تفصیل سے واضح کیا گیا، اور ان کا حکم عام نہیں کیا جا سکتا۔ ثانیاً امام ابن قیم الجوزیہ کہتے ہیں کہ ان آیات کا حکم عام بھی سمجھا جائے تو ان سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ امن کا معاہدہ اب جائز نہیں رہا۔ اس کے برعکس ان آیات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاہدے پر عمل لازم ہے اور اگر اسلامی ملک معاہدے کی ذمہ داریوں سے سبکدوش بھی ہونا چاہے تو وہ اس کی اطلاع باقاعدہ طور پر دوسرے فریق کو دے گا اور اسے کافی مہلت بھی دے گا۔ ابن القیم کے قول کے مطابق ان آیات کے نزول کے وقت کفار کی چار قسمیں تھیں (۸۲):

۱) وہ کفار جن کیساتھ کوئی امن کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ ان لوگوں کو جو اشہر حرم کے ختم ہونے تک مہلت دی گئی:

و اذان من اللہ و رسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بری ء من المشرکین و رسولہ۔ (۸۳)

''اور اعلان عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لئے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے، اور اس کا رسول بھی۔''

فاذا انسلخ الاشہر الحرم فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم۔ (۸۴)

''پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو ان مشرکین کو قتل کرو جہاں بھی انہیں پاؤ۔''

۲) وہ کفار جن کے ساتھ امن کا معاہدہ موقتاً ہوا تھا اور انہوں نے نقض معاہدہ بھی نہیں کیا تھا۔ ایسے لوگوں کے متعلق حکم دیا گیا کہ ان کے ساتھ کیے گئے معاہدوں پر وقت مقررہ تک پوری طرح عمل کیا جائے۔

الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئا و لم یظاھروا علیکم احدا فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم۔ (۸۵)

''بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کیے پھر انہوں نے اپنے عہد کے پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مقررہ مدت تک عہد پورا کرو۔''

۳) وہ کفار جن کے ساتھ امن کا معاہدہ موقتاً ہوا تھا لیکن وہ نقض عہد کے مرتکب ہو چکے تھے؛ اور

۴) وہ کفار جن کے ساتھ امن کا معاہدہ مطلقاً ہوا تھا۔

ان موخر الذکر دونوں گروہوں کو چار مہینے کا الٹی میٹم دیا گیا۔

براءۃ من اللہ و رسولہ الی الذین عاھدتم من المشرکین۔

فسیحوا فی الارض اربعۃ اشھر و اعلموا انکم غیر معجزی اللہ و ان اللہ مخزی الکفرین۔ (۸۶)

''اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو۔ اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔''

امن معاہدات کے عدم جواز کی ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ یہ جہاد کی فرضیت کو ساقط کرنے کے مترادف ہے۔ یہ استدلال بھی قطعاً غلط ہے۔ اگر جہاد کا مقصد قتال کے بغیر معاہدے کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہو اور قتال کی علت محاربہ ہو جو مفقود ہو تو خواہ مخواہ قتال کی کاروائی کے لئے جواز کہاں سے فراہم کیا جائے گا؟ فقہاء کی غالب اکثریت نے جب محاربے کو قتال کی علت قرار دیا تو اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ امن معاہدہ موقتاً بھی جائز ہو

اور مطلقا بھی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے:

امام شافعی سے اس سلسلے میں دو اقوال مروی ہیں۔ ایک یہ کہ موادعة میں وقت کی قید بیان کرنا ضروری ہے اور ایک وقت میں دس سال سے زائد مدت کے لئے موادعة نہیں کیا جاسکتا، البتہ اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو دس سال بعد پھر مزید مدت کا اضافہ کیا جاسکے گا۔ (۸۷) اس قول کی بنیاد یہ ہے کہ قتال کی علت کفر یا شوکت کفر ہے۔ اس قول کی غلطی ہم پیچھے واضح کر چکے ہیں۔ دوسرا قول امام شافعی سے یہ مروی ہے کہ موادعة وقت کی قید کے بغیر مطلقاً بھی جائز ہے۔ امام احمد بن حنبل سے بھی یہی دو قول مروی ہیں اور ابن القیم نے اسی دوسرے قول کی ترجیح دی ہے۔ (۸۸) حنفیہ کا تو مسلک ہی یہی ہے کہ موادعة موقتاً بھی کیا جاسکتا ہے اور مطلقاً بھی۔ وقت کی قید مقرر کرنا یا اسے مطلق چھوڑ دینا حکمران کے اجتہاد پر منحصر ہے اور وہ پابند ہے کہ ہر فیصلہ امت مسلمہ کے مفاد اور مصلحت کو مدنظر رکھ کر کرے (۸۹) یہی قول مالکیہ کا ہے۔ (۹۰)

جمہور فقہاء موادعة کو، چاہے وہ مطلق ہو یا موقت، عقد لازم سمجھتے ہیں، یعنی کوئی بھی فریق دوسرے فریق کی مرضی کے بغیر یکطرفہ طور پر معاہدہ ختم نہیں کر سکے گا۔ حنفیہ ہر دو صورتوں میں اسے عقد غیر لازم قرار دیتے ہیں، یعنی کوئی بھی فریق اسے کسی بھی وقت یکطرفہ طور پر ختم کر سکے گا، البتہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ اگر وہ اسے یکطرفہ طور پر ختم کر رہے ہوں تو دوسرے فریق کو اپنے فیصلے سے صراحتاً آگاہ کر دیں اور انہیں احتیاطی تدابیر اپنانے کا پورا موقع دیں:

و اما تخافن من قوم خيانة فانبذ اليهم على سواء۔ (۹۱)

''اور اگر تمہیں کسی قوم کی جانب سے خیانت کا قوی اندیشہ ہو تو اس معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو۔''

امام ابن القیم کی رائے یہ ہے کہ مطلق ہونے کی صورت میں موادعة غیر لازم ہوتا ہے، جبکہ موقت ہونے کی صورت میں لازم ہوتا ہے۔ یہ ان کی اس تفسیر سے موافق ہے جو انہوں نے سورۃ التوبۃ کی آیات کے متعلق پیش کی۔

بین الاقوامی قانون میں بھی ابتدا ہی سے دو مکاتب فکر رہے ہیں؛ ایک فریق کی رائے یہ ہے کہ امن کا معاہدہ غیر لازم ہوتا ہے اور دوسرے فریق کا کہنا ہے کہ یہ لازم ہوتا ہے۔ ''معاہدات کے متعلق میثاق ویانا'' میں اس موخر الذکر رائے کو مانا گیا ہے۔ (۹۲) تاہم اب بھی ماہرین کی معتد بہ تعداد اس کی قائل ہے کہ امن کا معاہدہ غیر لازم ہوتا ہے۔ (۹۳)

(جاری ہے)

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے

محترمہ ناہید علی زئی *

بچوں کی تعلیم وتربیت اوران کی رہنمائی کا طریقہ کار
(قرآن وحدیث کی روشنی میں)

قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں تعلیم وتعلم بچوں کی رہنمائی اور رہنمائی کا طریقہ کار ایک بہت ہی اہم موضوع ہے مسلمانوں نے جو علمی ترقیاں کیں۔ بڑے بڑے علمی مکاتب قائم کئے۔ کتابیں تصنیف کیں؛ جس کے باعث وہ ساری دنیا کے معلم بنے۔ اس کی اساس قرآن وحدیث کی تعلیمات اور حضور ﷺ کی ہدایات کی بنیاد پر ہوسکتی ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے پہلے قرآن کی وہ آیات تحریر کی جاتیں ہیں جس میں بچوں کی تعلیم وتربیت اور نگہداشت کی ہدایت پائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد احادیث اور بعد میں رہنمائی کے طریقہ کار کا ذکر کیا جائے گا۔

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

واذا بلغ الاطفال منکم الحلم فلیستاذنوا کما استاذن الذین من قبلهم۔ کذلک یبین الله لکم ایته والله علیم حکیم۔ (سورۃ النور ۵۹)

ترجمہ: ''اور جب پہنچیں لڑکے تم میں کے عقل کی حد کو ان کو ویسی ہی اجازت لینی چاہیے جیسے لیتے رہتے ہیں' ان سے اگلے' یوں کھول کر سناتا ہے۔ اللہ تم کو اپنی باتیں' اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔''

اس آیات کی تفسیر میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ معارف القرآن میں تحریر فرماتے ہیں۔

''یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں بالغ مرد عورت کو استیذان کا حکم دینا تو ظاہر ہے۔ مگر نابالغ بچے جو شرعاً کسی حکم کے مکلّف نہیں ان کو اس حکم کا پابند کرنا بظاہر اصول کیخلاف ہے۔ جواب یہ ہے کہ اسکے مخاطب دراصل بالغ مرد عورت ہیں کہ وہ چھوٹے بچوں کو بھی سمجھا دیں کہ ایسے وقت میں بغیر پوچھے اندر نہ آیا کرو۔ جیسے حدیث میں ہے کہ بچوں کو جبکہ وہ سات برس کے ہوجائیں تو نماز سکھاؤ اور نماز پڑھنے کا حکم دو اور دس برس کے بعد سختی سے نماز کے پابند کرو۔ نہ مانیں تو مار کر نماز پڑھاؤ۔ اس طرح استیذان کا اصل حکم بالغ مرد عورت کا ہے۔ (معارف القرآن جلد ۶)

---

* لیکچرر شعبہ عربی وعلوم اسلامیہ' گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان

اس آیت کی تشریح میں یہ بات صراحت کے ساتھ آ گئی ہے کہ بالغ مرد عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے ان زیر نگرانی بچوں کو گھر میں رہنے کے آداب بتائیں۔ زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھائیں اور اشارۃً یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ والدین بچوں کو تعلیم دین کے سارے احکام ان کو سمجھائیں۔ نیکی اور بدی کے کاموں سے ان کو واقف کرائیں۔ اولاد کے ساتھ محبت اور ان کی دیکھ بھال فطری جذبہ ہے جو دیگر حیوانات اور انسان میں مشترک ہے۔ انسان اشرف المخلوقات اور کائنات میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہے۔ بقائے نوع انسانی کے علاوہ اس کو اور بھی ارفع واعلیٰ فرائض سپرد کئے گئے ہیں۔ اولاد کی تعلیم وتربیت ان میں سرفہرست ہے۔

سورۃ الطّور آیت نمبر ۲۱ میں ہے۔

والذین امنوا واتبعتهم ذریتهم بایمان الحقنابهم ذریتهم وما التنهم من عملهم من شئی کل امری بما کسب رهین" (الطّور۔۲۱)

ترجمہ: اور جو لوگ یقین لائے اور ان کی راہ پر چلی ان کی اولاد ایمان سے پہنچا دیا ہم نے ان تک ان کی اولاد کو اور گھٹایا نہیں ہم نے ان سے ان کا کیا ذرا بھی ہر آدمی اپنی کمائی میں پھنسا ہے۔ (معارف القرآن۔ ج ۸)

حافظ ابن کثیر نے روایات مذکورہ نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ آخرت میں ان روایات سے تو یہ ثابت ہوا کہ آباء صالحین کی برکت سے ان کی اولاد کو فائدہ پہنچے گا اور عمل میں ان کا درجہ کم ہونے کے باوجود اپنے آباء صالحین کے درجے میں پہنچا دیئے جائیں گے۔ اس کا دوسرا رخ کہ اولاد صالحین کی وجہ سے والدین کو نفع پہنچے۔ یہ بھی حدیث سے ثابت ہے۔ مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ اپنے بعض نیک بندوں کا درجہ جنت میں اس کے عمل کی مناسبت سے بہت اونچا کر دیں گے۔ تو یہ دریافت کرے گا کہ اے میرے پروردگار! مجھے یہ مقام اور درجہ کہاں سے مل گیا۔ (میرا عمل تو اس قابل نہ تھا۔) تو جواب یہ دیا جائے گا کہ تمہاری اولاد نے تمہارے لئے استغفار اور دعا کی اس کا یہ اثر ہے۔ (معارف القرآن جلد ۸)

اس آیت کی تشریح میں یہ بات صراحت کے ساتھ آ گئی ہے کہ نیک لوگوں کی برکت سے ان کی نیک اولاد کو بھی فائدہ ملے گا' اس طرح نیک اولاد کی والدین کیلئے استغفار اور ان کے حق میں ان کی دعا سے ان کے والدین کو درجات کی بلندی نصیب ہوگی۔

اولاد کا نیک اور صالح ہونا والدین کی تربیت پر منحصر ہے۔ والدین انکی تعلیم وتربیت کو اولیت دیں۔ ان کے اعمال کی نگرانی کریں۔ منکرات سے ان کو بچائیں۔ جب بچپن میں ایک بچے کی اس نہج پر نگہداشت ہو جائے تو وہ باقی زندگی بھی اس بنیاد پر گزارنے کو اولیت دے گا۔ جس طرز عمل سے اولاد کو نفع ملے گا۔ ان کے والدین کو درجات کی بلندی نصیب ہوگی۔ اسلام نے اولاد کی پرورش' دودھ پلانا' خبر گیری اور اخراجات ان تمام چیزوں کا بوجھ والدین پر رکھا

ہے۔اس کے بعد اولاد کی باطنی اور روحانی تربیت کا درجہ ہے۔قرآن پاک نے یہ حق یوں ادا کیا ہے:

سورۃ التحریم میں ارشاد باری ہے:

یاایھا الذین امنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا وقودھا الناس والحجارۃ (التحریم آیت۔۶)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔''

قرآن کریم کی درج بالا آیت اور دیگر آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کی صرف ذاتی نجات کافی نہیں۔اسلام ہر شخص کی یہ ذمہ داری مقرر کرتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی نجات کا بھی بندوبست کرے۔صرف ذاتی ہدایت پر اکتفا نہ کرے دوسرے کو بھی ہدایت کرے۔خاندان کے سربراہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اہل وعیال کی ایسی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے قائل ہوں اس کے احکامات کو مانیں اور فکر آخرت پیدا کریں' دنیوی خوشحالی کے علاوہ وہ ابدی زندگی میں سرخروئی اور کامیابی کی بھی فکر کرے۔

اولاد کا اپنے والدین پر اولین حق یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں سے بے پرواہ نہ ہوں یا ان کا نقش حیات محو کرنے کے کا باعث نہ بنیں بلکہ ان کی امکانی پرورش اور تعلیم و تربیت کرکے ان کے لئے کامیاب زندگی کے تمام وسائل مہیا کریں۔

<u>بچوں کی تعلیم وتربیت: (احادیث کی روشنی میں)</u>

۱۔ وعن جابر ابن سمرۃؓ قال قال رسول اللہ لان یودب الرجل ابنہ خیرلہ من ان یتصدق بصاع (ترمذی) ''جابر بن سمرۃؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسولؐ نے کہ باپ کا اپنے بچے کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے۔''

۲۔ ارشاد نبوی ہے کہ باپ کا کوئی عطیہ اپنے بیٹے کے لئے اس سے بڑھ کر اور افضل کوئی نہیں کہ وہ اس کی اچھی تعلیم وتربیت کرے اور اسے ادب سکھائے۔(ترمذی)

۳۔ حضرت معاذؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں دس باتوں کی وصیت فرمائی۔تین باتیں جن کا اس مضمون سے تعلق ہے یہ ہیں۔

و انفق علی عیالک من طولک۔''اپنے اہل وعیال پر اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا۔

ب۔ و لاترفع عنھم عصاک ادبا۔''اور ادب سکھانے کی وجہ سے اپنی لاٹھی انکی جانب سے اٹھا کر مت رکھو۔(یعنی اولاد کی تعلیم وتادیب کے سلسلے میں غفلت نہ برتی جائے اور ضرورت

کے وقت تادیباً سزا دینے میں کوتاہی نہ کی جائے۔

ج۔ و اخفھم فی اللہ اوران کو اللہ تعالیٰ (کے احکامات) کے بارے میں ڈراتے رہنا۔

۴۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز پڑھنے کا حکم دو اور جب دس برس کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو اسے مار کر نماز پڑھاؤ۔ (ابوداؤد)

۵۔ اگر ایک طرف ایسی روایت ملتی ہیں جس میں علم کی فضیلت واہمیت بتائی گئی ہے اور اس کے حصول کی ترغیب دلائی گئی ہے تو دوسری طرف ایسے انتظامات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ جس کے باعث علم کا حصول آسان ہو جائے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ احادیث کی کتابوں میں ملتا ہے۔

''جب جنگ بدر میں کافی کافر قیدی بنے۔ ان قیدیوں میں بعض ایسے بھی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے مالی فدیہ طلب کرنے کی بجائے ان کا فدیہ یہ مقرر فرمایا کہ یہ لوگ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ چنانچہ انصار کے بچوں نے قیدیوں سے لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ (اسد الغابہ)

ابن سعد کی روایت میں ہے کہ مدینہ کے دس دس بچوں کو ہر ایک قیدی لکھنا پڑھنا سکھائیں۔

۶۔ آزاد بچوں کے علاوہ غلاموں کی تعلیم وتربیت کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ اس طرح یتیموں کو بھی تعلیم دلائی جاتی تھی۔ ابو عامر سلیمؒ جو رواۃ حدیث میں سے ہیں ان کی زبانی روایت ہے کہ میں بچپن میں گرفتار ہو کر مدینہ میں آیا تو یہاں مجھ کو مکتب میں بٹھایا گیا۔ معلم مجھ سے جب میم لکھواتا تھا اور میں اچھی طرح نہیں لکھ سکتا تھا کہتا کہ گول لکھو، جس طرح گائے کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ (اسوۂ صحابہ، جلد نمبر ۲، ص ۲۰۰)

۷۔ حضرت عمرؓ نے تمام اضلاع میں احکام بھیجے تھے کہ بچوں کو (قرآن وسنت کے وسیع نصاب کے علاوہ) شہسواری، نشانہ بازی، تیراکی اور کتابت کی تعلیم دی جائے۔ (معجم البلدان)

۸۔ حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ جو لڑکا طالب علم اور عبادت میں نشو ونما پاتا ہے، یہاں تک کہ بڑا ہو جاتا ہے اور اپنی اس حالت میں استوار رہتا ہے تو اسے ستر صدیقوں کا ثواب ملتا ہے (العلم والعلماء)

۹۔ حضرت حسنؓ نے اپنے لڑکوں اور بھتیجوں کو نصیحت کی ''علم حاصل کرو کیونکہ گو آج تم قوم کے چھوٹے ہو مگر کل تم ہی قوم کے بڑا بننے والے ہو۔ جس نے یاد نہ کیا ہو لکھ کر یاد کرے۔ (العلم والعلماء)

۱۰۔ حضرت عروۃ ابن الزبیرؒ اپنے لڑکوں سے کہا کرتے تھے کہ آؤ مجھ سے علم حاصل کرو، کیونکہ عنقریب تم قوم میں بڑے آدمی ہو گے، میں بھی پہلے چھوٹا تھا۔ اور میری کوئی پرواہ نہ کرتا تھا۔ لیکن جب جوان ہوا تو لوگ دوڑ دوڑ کر آئے۔ اور مجھ سے فتویٰ لینے لگے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا عیب ہو سکتا ہے کہ آدمی سے اس کے دین کی کوئی بات پوچھی

جائے اور وہ جاہل نکلے۔(العلم العلماء)

۱۱۔ جب ہجرت کے بعد آنحضرتؐ قبا سے نکل کر بنونجار کے علاقے میں تشریف لے آئے اور وہاں مستقل اقامت کا ارادہ ظاہر فرمایا تو وہاں مسجد نبوی کی تعمیر ہونے لگی اس مسجد کا ایک حصہ تعلیم گاہ کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔جس کو صفہ کا نام دیا گیا۔یہ روایت بھی ملتی ہے کہ صفہ کے بعد جلد ہی اور تعلیم گاہیں قائم کر دی گئیں۔

بلاذریؒ نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ مدینہ میں عہد نبوی میں نو مساجد تھیں' رسول اللہ نے لوگوں کو حکم دیا تھا' کہ اپنے محلے کی مسجد میں اپنے ہمسایوں سے تعلیم حاصل کرو سب کے سب مرکزی مسجد میں نہ آیا کرو۔کیونکہ اس سے طالب علموں کی تعداد بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔جس سے سب کی تعلیم متاثر ہوتی اور ناکافی اساتذہ کے باعث بچوں کو تعلیم پانے کا موقع نہ مل سکتا۔

۱۲۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب انسان مرجاتا ہے' تو اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے مگر تین قسم کے عمل باقی رہ جاتے ہیں' جن کا اجر وثواب اس کو مرنے کے بعد بھی مسلسل ملتا رہتا ہے۔

<u>اول صدقہ جاریہ:</u>

یعنی صدقہ وخیرات کا ایسا کام جس سے لوگ طویل عرصے تک فائدہ اٹھاتے رہیں۔مثلاً عام لوگوں کے استعمال کے لئے کنواں کھودنا' تالاب بنانا' مسجد تعمیر کروانا وغیرہ۔

دوم ایسا عمل جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔مثلاً درس گاہ قائم کرنا' تصنیف وتالیف کا کام کرنا۔یا ایسے شاگرد تیار کرنا جو اپنے استاذ کے علم کو آگے بڑھائیں اور اس کو دوسروں تک پہنچاتے رہیں۔

سوئم نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی رہے۔(مشکوۃ شریف)

اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اولاد کو صحیح تعلیم وتربیت دینا اور ان کو نیکی کے راستے پر چلانا ایسا صدقہ جاریہ ہے' جس کا اجر وثواب والدین کو ان کے مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔اور اسی اولاد کے نیک اعمال کا اجر وثواب والدین کے اعمال نامے میں لکھا جاتا رہے گا۔اور نیک اولاد اپنے والدین کو ہمیشہ دعائے خیر میں یاد رکھے گی کہ ان کی تربیت کی بدولت ان کو اعمال کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔

<u>رہنمائی کا طریقہ کار:</u>

لوگ جو کچھ اپنے اسلاف سے تعلیم کے ذریعے حاصل کرتے ہیں' اپنی جدوجہد' مشقت اور عملی تجربات سے جو خزانہ جمع کئے ہوئے ہوتے ہیں۔طبعی طور پر چاہتے ہیں کہ اس کو اپنی نسل کے سپرد کر دے۔اور اس حال میں اس جہان سے رخصت ہوں کہ یہ اسلاف کی امانت اپنے اخلاف کے سپرد کریں۔اب اگر ان نونہالوں کی صحیح تعلیم وتربیت کی گئی ہو' انہیں زیور علم سے آراستہ کیا گیا ہو' تو پھر ان کا انفرادی بھی اور اجتماعی ملک وقوم کا بھی مستقبل تابناک ہوگا۔

قوموں کے عروج زوال کی داستانوں میں یہ بات ایک اہم عنصر کے طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ عروج پانے والی قوموں نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت پر نہ صرف خصوصی توجہ دی بلکہ اپنی تمام تر صلاحیتیں' اپنے بچوں کی صلاحیتیں اجاگر کرنے میں صرف کیں اور جن قوموں کو زوال کا روز بد دیکھنا پڑا وہ اس وجہ سے ہوا کہ ان کے بزرگ عیش وعشرت میں پڑے رہے۔ اور اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت اور یوں ان کے مستقبل سنوارنے سے غافل رہے۔ بچپن کے ماہ و سال کا دور ہی ایک نہایت نازک زمانہ ہوتا ہے' جس پر آئندہ کی تمام خوبیوں اور خرابیوں کا دارومدار ہوتا ہے۔ لہذا انسانی زندگی میں یہی دَور سب سے زیادہ قابل توجہ ہوتا ہے۔ بچے کا دماغ صاف وشفاف آئینہ ہوتا ہے۔ وہ ہر اس چیز کا عکس لے لیتا ہے جو اس کے مقابل آتا ہے۔ وہ غور سے دیکھتا اور سنتا ہے' پھر جس طرح وہ دیکھتا اور سنتا ہے اس طرح اس کا نقل کرتا ہے اس صاف شفاف آئینہ پر جو'ھ مرتب ہوتا ہے وہ اپنے گہرے اثرات مرتب کرتے ہے' اب یہ بزرگوں کے ہاتھ واختیار میں ہے کہ وہ چاہیں تو بچے کو اچھا انسان اور اچھا مسلمان اور اپنے ملک وملت کے مستقبل کا معمار بنادیں۔ اور اگر چاہیں تو اسے بدکردار' موذی اور ملک وملت کا دشمن بنادیں۔ اسلام میں بچوں کی نگہداشت' تربیت واصلاح اور ان کی تعلیم تربیت پر زور دیا گیا ہے (جیسے کہ مندرجہ بالا قرآن واحادیث کے حوالے سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے) مسلم مفکرین کے خیالات جو اس ضمن میں اہم رہنما اصول کے طور پر کام دے رہے ہیں نہایت اہم ہیں۔ جن سے ہمارے موضوع کی وضاحت ہوتی ہے۔

امام غزالیؒ احیاالعلوم الدین میں فرماتے ہیں کہ والدین اور اساتذہ کو بچوں کی تعلیم وتربیت کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بچے کی اقبال مندی میں اس کے والدین اور سرپرستوں کا فرض ہے کہ ان پر پوری پوری توجہ دیں۔ انہیں اچھے طور طریقے سکھائیں ان کی اخلاقی تربیت کریں' بری صحبت سے بچائیں۔ بچے کو سخت اور جفاکش زندگی کا عادی بنایا جائے نہ کہ عیش وتنعم کا' خودداری' خوداعتمادی' شرم وحیا' اور خلوص اس کی نمایاں خصوصیات ہوں' اس کے دل میں مال ودولت کی ہوس نہ پیدا کی جائے۔ کیونکہ یہی چیز بلاوجہ لڑائی جھگڑے کا باعث ہوتی ہے۔ (احیاءالعلوم الدین' ص ۱۵۷)

امام غزالی کے نزدیک جب بچہ سن شعور کو پہنچے تو اس کو کسی اچھے مربی کے سپرد کیا جائے۔ جو اسے مفید اور ضروری تعلیم دے۔ (احیاءالعلوم الدینیہ' ص ۱۵۹)

شیخ بوعلی سینا کے نزدیک ہر بچے کو اس کی طبعی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھ کر تعلیم دی جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بچے کو قرآن حکیم اور زبان کی ابتدائی تعلیم کے بعد اس کی صلاحیتوں کے مطابق تعلیم دی جائے اور اسے وہی پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔ جس کے لئے قدرت نے اسے موزوں کیا ہے۔

یہ ذمہ داری وہ اساتذہ پر ڈالتے ہیں کہ وہ طلباء کی مخصوص صلاحیتوں کا جائزہ لیں۔ اور پھر جو مضمون اس کی

صلاحیتوں کے مطابق ہو اس کے حصول کا انہیں مشورہ دیں۔ (تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ)

علامہ ابن خلدون تعلیم کو بچوں کا بنیادی حق قرار دیتے ہیں' اور صرف اس طریقہ تعلیم کو مفید قرار دیتے ہیں جو انہیں تحقیق و جستجو کا مادہ پیدا کر سکے۔ (مقدمہ ابن خلدون)

علامہ ابن خلدون جو طریقہ تجویز کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اساتذہ طلباء کے سامنے مسائل رکھیں اور علمی موضوعات پر ان سے گفتگو کریں' مباحثہ کریں' طلباء کے درمیان باہمی مباحثہ کا اہتمام کرائیں تا کہ طلباء میں اپنے مضمون کے متعلق مہارت پیدا ہو سکے۔

حضورؐ کی بعثت کے مقاصد میں ایک اہم مقصد ''یعلمھم الکتاب''، یعنی تعلیم کتاب ہے۔ حضور کریمؐ کی زندگی سے ہمیں رہنمائی کا طریقہ کار ملتا ہے کہ کس طریقہ سے آپؐ نے اپنا فرض بطریق احسن انجام فرمایا۔ اور ہماری تعلیم و تربیت میں رہنمائی فرمائی۔ آپ نے تعلیم و تربیت کی کچھ خصوصیات بتائیں۔

۱۔ آپؐ کو اس بات کا خاص خیال ہوتا تھا کہ تعلیم و تربیت کے لئے مناسب اوقات کا انتظام کیا جائے' تا کہ ان کے نصائح کو صدق دل سے قبول کیا جا سکے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

''آنحضرتؐ تخول سے کام لیتے تا کہ روزانہ اور ہر وقت کی تعلیم و نصیحت سے طبائع اکتا نہ جائیں۔''

حضورؐ کی تعلیم و تربیت کا یہ انداز موجودہ دور کے تربیتی اداروں نے بھی اپنا رکھا ہے اور اس انداز کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کر کے یہ اعتراف کیا ہے کہ تعلیم اسی وقت صحیح نتائج پیدا کرتی ہے۔ جب طلباء کی نفسیات کا خیال رکھا جائے اور دیکھا جائے کہ کب اور کس وقت طلباء کے ذہن و قلب حاضر ہیں۔

۲۔ آنحضرتؐ کا طریقہ تھا کہ وہ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں ہر شخص کی ذہنی سطح کا پورا پورا خیال رکھتے۔ کیونکہ ہر شخص کی ذہنی سطح دوسرے سے مختلف ہوا کرتی ہے۔ شہری لوگوں سے ان کے معیار کے مطابق گفتگو فرماتے۔ تو بدوی کے ساتھ اس کی ذہنیت کے مطابق۔

حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت اس کی بہترین مثال ہے کہ ایک بدوی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔ جو سیاہ رنگ کا ہے۔ چونکہ ہم میاں بیوی میں کوئی سیاہ رنگ نہیں اس لئے میں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ حضورؐ نے اس کی سمجھ اور پیشہ کو ملحوظ رکھ کر اسے جواب ارشاد فرمایا اور اسے سمجھایا۔

حضورؐ نے اس سے پوچھا'' کہ تمہارے پاس کچھ اونٹ ہیں''

بدوی نے جواب دیا۔ ''جی ہاں''

آپؐ نے پوچھا کہ ''کیا ان اونٹوں میں خاکستری رنگ کا یا کہ سیاہ رنگ کا بھی کوئی اونٹ ہے''

اس نے جواب دیا ''ہاں ہے''

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ''اب تم ہی بتاؤ کہ سرخ رنگ کے اونٹ میں یہ سیاہی کیسے آگھسی۔ بدوی نے جواب دیا ہوسکتا ہے کہ اس کے نسب میں کوئی اونٹ خاکستری یا سیاہ رنگ کا ہو اور اس کی جھلک ہو''

جب سوال و جواب کی صورت میں حضورؐ بدوی کو یہاں تک لے آئے تو آپؐ نے یہ فرما کر اس کا شبہ دور کر دیا کہ ''یہاں بھی ایسا ہوسکتا ہے کہ یہ نسب کی وجہ سے ہوا ہو اور اس میں تمہاری بیوی کا کوئی قصور نہ ہو'' (تجرید البخاری)

۳۔ حضورؐ جب بھی اپنے صحابہ کرامؓ کو کوئی دینی حکم سمجھاتے تو اس کو تین مرتبہ دہراتے تاکہ بات دل کی گہرائیوں تک اتر جائے اور کم ذہن والے لوگ بھی اس کو سمجھ جائیں۔

حضرت انس بن مالکؓ ارشاد فرماتے ہیں۔

''کہ آنحضرتؐ جب کچھ ارشاد فرماتے تو ہر ایک کلمہ کا تین تین مرتبہ اعادہ فرماتے تاکہ سننے والا اچھی طرح فہم و ادراک کی گرفت میں لے آئے۔ (سنن ابی داؤد)

۴۔ حضورؐ احکام و عبادات میں آسانی کو ملحوظ رکھتے اور ان صحابہ کرامؓ جو معلمی میں دلچسپی رکھتے ان کو مختلف ہدایات کے ساتھ اہم بات یہ بھی ارشاد فرماتے کہ ''تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے۔ دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے (صحیح بخاری)

حضرت محمدؐ نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک خاص حکمت سے کام لیا۔ اور حضرت محمدؐ کے رہنما اصولوں کو سامنے لا کر بچوں کی تعلیم و تربیت کی جائے تو مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ حضرت محمدؐ نے والدین پر اولاد کی اخلاقی، تربیت، دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے اور بچوں کی تعمیر اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کی نشوونما میں جو اہمیت اور مقام تعلیم و تربیت کو حاصل ہے کسی دوسری چیز کو حاصل نہیں۔

مسلمان والدین کی حیثیت سے ہمیں سب سے پہلے حضورؐ کے طریقہ تعلیم و تربیت سے رہنمائی اور روشنی حاصل کرنا ہوگی، حضورؐ نے بچوں کو جنت کا پھول کہہ کر پکارا اور بچوں سے ہمیشہ انتہائی شفقت فرمائی۔ ان سے پیار کیا اور جو بات بھی سمجھائی پیار و محبت سے سمجھائی اور بچے کی پیدائش کے پہلے دن سے ہی تربیت کا خیال رکھنے کی تلقین کی۔ مثلاً بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی کان میں اذان اور تکبیر کا کہنا۔ پہلا لفظ اللہ کہلوانا۔ دینی تعلیم دلوانا وہ مثبت اقدامات ہیں جو کہ بچے کی زندگی کے ساتھ ہی شروع ہو جاتے ہیں۔